میاں عبدالرشید

مقصدِ حیات

انسانی زندگی کا مقصد شخصیت کی تعمیر اور استحکام ہے جیسے حیات انسانی اپنے پیچھے کروڑوں برس کے مختلف حیوانی مراحل چھوڑ کے آئی ہے اسی طرح اس کے آگے بھی ملکوتی زندگی کے تا ابد پھیلے ہوئے مختلف امکانات ہیں اور انسان ان دونوں کے درمیان ایک نہایت مختصر مگر ساتھ ہی نہایت نازک اور اہم کڑی ہے کھرب ہا کھرب کی سابقہ زندگی اور اسی طرح تا ابد پھیلی ہوئی آئندہ زندگی کے مقابلہ میں حیات انسانی کے ساٹھ ستر برس کی وہی نسبت ہے جو پوری انسانی زندگی میں ایک سیکنڈ کے کروڑویں حصہ کی ہو بلکہ اس سے بھی بہت ہی کم (دراصل یہ کہنا بھی محض سمجھنے سمجھانے کے لئے ہے ورنہ محدود کی غیر محدود سے کوئی نسبت نہیں) مگر اس کی اہمیت ملاحظہ ہو کہ اس ایک سیکنڈ کے کروڑویں حصہ سے مرتب شدہ نتائج پر ہمیشہ ہمیشہ کی کامیابی یا ناکامی کا دارومدار ہے۔

زندگی نے گذشتہ کروڑوں برس کے مختلف مراحل سے وراثت اور ماحول کے اثرات کی صورت میں جو کچھ حاصل کیا ہوتا ہے انسانی مرحلہ اس کی تطہیر اور پختگی کے لئے ہے تاکہ اس حال میں جو مضر یا تخریبی اثرات شامل ہو چکے ہوں انھیں اس مرحلہ پر مسترد کر دیا جائے اور جو مفید اور تعمیری اثرات ہوں انھیں پختہ کر لیا جائے۔ ہماری زبان میں پہلے عمل کو تقویٰ کہا جاتا ہے اور دوسرے کو احسان۔ اور تعمیر شخصیت انہی دو عملوں سے مرکب ہے۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا[1] ۔ ترجمہ :۔ اور جان کی قسم اور اس کی جس نے اسے ٹھیک ٹھیک بنایا۔ اور اسے اس کا فجور اور تقویٰ الہام کر دیا۔ یقیناً وہ مراد کو پہنچا جس نے اسے پاک کیا۔ اور نامراد ہوا وہ جس نے اسے دفن کر دیا۔

---

[1] قرآن ۹۱: ۷ تا ۱۰

مگر تطہیر و تثبیت کا یہ عمل سرانجام کیسے پائے؟ یہ کیسے پتہ چلے کہ فلاں چیز قائم رکھنے کی ہے اور فلاں چھانٹ دینے کی اور پتہ چل بھی جائے تو پھر وہ قوت کہاں سے حاصل ہو جس میں چھانٹنے کے قابل چیزیں چھانٹی جا سکیں اور باقی رکھنے والی قائم رکھی جائیں؟ ہمارا روز مرّہ کا مشاہدہ ہے کہ زندگی کے ہر مرحلہ پر اس مرحلہ کی ضروریات کا سامان بطریق احسن و بدرجہ اتم مہیا کر دیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسانی مرحلہ پر بھی جو اپنے نتائج کے اعتبار سے تمام مراحل میں سے اہم ترین ہے، ضرور اس مرحلہ کی جملہ ضروریات پورا کرنے کا انتظام ہوگا۔ اور بہترین انتظام ہوگا۔ اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں چونکہ اس مرحلہ کی اہم ترین ضرورت یہی ہے کہ وراثت اور ماحول کے مفید و مضر تاثرات میں فرق کرنے کی سمجھ اور پھر ان میں سے مفید کو قائم رکھنے اور مضر کو مسترد کرنے کی قوت حاصل ہو جائے۔ اس لئے لازماً اس کا بھی انتظام ہوگا۔ بلکہ یقیناً ایسا انتظام ہے ہر انسان کے اندر اللہ نے اپنی روح میں سے پھونک[1] دی ہوئی ہے جس کے ذریعے اسے روشنی اور قوت حاصل ہوتی رہتی ہے بشرطیکہ وہ اپنی اس روح کو سنبھال کر رکھے اور اس سے کام لے۔ یہ تمام انسانی ارواح کسی نامعلوم طریق سے حق تعالےٰ کی روح کُل کے ساتھ منسلک ہیں اور انہیں ہر لمحہ وہاں سے روشنی اور حرارت بہم پہنچتی رہتی ہے جس سے تعمیری اور تخریبی تاثرات میں تغیر بھی ہو سکتا ہے اور انہیں اختیار یا مسترد کرنے کی قوت بھی حاصل ہوتی رہتی ہے۔

پھر روح کی مدد کے لئے عقل ہے جو روح کے تاثرات کو دلائل و براہین کے ساتھ پیش کرتی ہے اور انہیں حکمت سے عمل میں لانے کا راستہ وضع کرتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تعمیر شخصیت کا یہ عمل انفرادی طور سے سرانجام پائے یا اجتماعی طور سے؟ جہاں تک انسان کی اندرونی کشمکش کا تعلق ہے جو اسے اپنے بعض رجحانات کو اختیار اور بعض دیگر کو مسترد کرنے کے سلسلہ میں پیش آتی ہے وہ نہ صرف اس کا انفرادی عمل ہے بلکہ اس کے اس ذہنی تجربہ میں کوئی اور شریک بھی نہیں ہو سکتا۔ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی، کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ اور نہ کوئی اپنا بوجھ اٹھانے سے بچ سکتا ہے۔ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ

---

[1] ۔ سورۃ نمبر ۱۵، رکوع ۲۸۔

خَيْرًا يَرَهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ایک طرف وراثت اور ماحول کے "زمینی" اثرات ہیں جو انسان کو پیچھے حیوانی زندگی کی طرف کھینچتے ہیں اور دوسری طرف روح میں جبوہ گر ہونے والے آسمانی انوار و تجلیات ہیں جو اسے بلندیوں کی طرف اٹھاتے ہیں۔ انسان ان دونوں کی کشمکش کا میدان ہے۔ یہ کشمکش انفرادی چیز ہے گو دوسرے اس میں شریک نہیں ہو سکتے۔ مگر ایک یا دوسری سمت اس کے معاون و مددگار ضرور ثابت ہو سکتے ہیں۔

انسان چونکہ فطرۃً اجتماعیت پسند ہے اس لئے فرد اور معاشرہ لازم ملزوم ہیں۔ افراد کا اثر معاشرہ پر پڑتا ہے۔ کیونکہ معاشرہ افراد سے مرکب ہوتا ہے اور معاشرہ کا افراد پر۔ کیونکہ افراد کی غالب اکثریت معاشرہ کی رو میں بہنے کی عادی ہوتی ہے۔ بالخصوص بچے اور نوجوان اپنے ماحول سے بہت جلد اور بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر معاشرہ صحت مند اقدار کا حامل ہو تو اس کے آغوش میں فرد کے لئے شخصیت کی تعمیر کا عمل آسان ہو جاتا ہے لیکن اس کے برعکس اگر معاشرہ شر و فساد سے بھرپور ہو، تو بیشتر افراد خود بخود اسی رنگ سے رنگے جاتے ہیں اور جو لوگ اس سے الگ روش اختیار کرنا چاہیں انہیں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں معاشرہ افراد کے لئے تربیت گاہ بھی ہے اور کسوٹی بھی۔ اس لئے معاشرہ سے الگ رہ کر شخصیت کی تعمیر کی کوشش کرنا پانی سے باہر پیراکی سیکھنے کے مترادف ہے۔

ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا تعمیر شخصیت کے اس عمل کو ہر فرد کی اپنی مرضی اور سمجھ پر چھوڑ دینا چاہیئے یا اس کے لئے کوئی مشترکہ پروگرام ہونا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ جو کام کسی پروگرام کے مطابق ہوگا وہ زیادہ آسانی سے سرانجام پائے گا۔ اس میں یک جہتی ہوگی۔ مقاصد کا تصادم نہیں ہوگا۔ ورنہ اگر اس عمل کو ہر شخص کے اپنے اوپر چھوڑ دیا جائے تو کئی تو سرے سے اس کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوں گے۔ کئی اس کی ضرورت سمجھنے کے باوجود سستی یا کاہلی کے باعث اس طرف کامیابی سے قدم نہیں اٹھا سکیں گے۔ کوئی کسی کٹھن اور دور دراز راہ پر چل نکلیں گے۔ کوئی بھٹک کر کسی غلط راہ پر پڑ جائیں گے اور افراد کی ایسی مختلف النوع کوششیں معاشرہ میں کوئی ہم آہنگی پیدا کرنے کی بجائے الٹا اس میں تفرقہ و افتراق کا موجب ہوں گی اور ان سے کوئی قابل قدر انفرادی یا اجتماعی فوائد حاصل نہیں ہو سکیں گے

دوسری طرف پروگرام میں یہ خطرہ ہے کہ بالعموم پروگرام بعد میں محض رسوم رہ جاتے ہیں اور ان کی ظاہری صورت متحجر و جامد ہو کر ان کی روح کا دم گھونٹ دیتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد اس پروگرام کے مقصد اور روح دونوں کو تو نظر انداز کر دیتے ہیں اور اس کی ظاہری صورت پر جھگڑتے اور لڑتے مرتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی صحیح قسم کا پروگرام مل جائے تو یہ خطرہ بھی مول لیا جا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پروگرام کے جامد ہو جانے کے بعد پھر ایسے لوگ آ جائیں جو اس کی روح کی جھلک دیکھ لیں اور اسے دوبارہ جھاڑ پونچھ کر اور صاف و شفاف کر کے اس میں زندگی کی نئی لہر دوڑا سکیں۔

لیکن تعمیر شخصیت کا پروگرام مرتب کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ سب سے پہلے تو وہ پروگرام ایسا ہونا ضروری ہے جس میں ایک طرف فرد اور معاشرہ ہر دو کی پہلو بہ پہلو تعمیر کی زیادہ سے زیادہ گنجائش ہو اور دوسری طرف ان دونوں میں ایسا خوبصورت توازن ہو کہ ان میں سے کسی ایک کی وجہ سے دوسرے کی تہذیب و ترقی کو نقصان نہ پہنچے۔ نہ انفرادی کردار کی تعمیر ایسے خطوط پر ہو کہ اجتماعی کردار خطرہ میں پڑ جائے یعنی ایسا نہ ہو کہ افراد اس قدر منہ زور اور خود سر ہو جائیں کہ معاشرہ میں انفرادی اور نزاج کی سی کیفیت پیدا ہو جائے۔ نہ اجتماعیت پر اتنا زور ہو کہ فرد کی شخصیت دم توڑ کے رہ جائے ــــ نہ وہ آزادی سے سوچ سکے اور نہ اپنے اخذ کردہ نتائج پر عمل کر سکے۔

اسی طرح انسان چونکہ روح عقل اور بدن تینوں کا مجموعہ ہے اس لئے تعمیر شخصیت کا صحیح پروگرام وہی ہو سکتا ہے جس میں روح عقل اور بدن تینوں کے تقاضے پورے ہوتے ہوں۔ وہ پروگرام ایسا نہ ہو جس میں محض بدنی ضروریات کو پورا کرنے پر اتنا زور ہو کہ انسان حیوانِ محض ہو کے رہ جائے۔ اس کی عقل موقی ہو جائے اور روح لاغر۔ نہ وہ پروگرام ایسا ہو جس میں محض عقل کو اتنی اہمیت دی گئی ہو کہ انسان بحث و تمحیص یا ابلیسی مکر و فریب کو زندگی کا ماحصل سمجھ بیٹھے۔ اس کے ہاتھ سے رشتۂ عمل بھی چھوٹ جائے اور وہ جذبۂ محبت و ایثار سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ اسی طرح وہ پروگرام ایسا بھی نہیں ہونا چاہیئے جو انسان کو روحانی کیفیات میں اتنا منہمک کر دے کہ وہ علم و عمل سے یگانہ محض ہو کے رہ جائے۔ نہ اس میں دنیا کے معاملات کا شعور رہے اور نہ یہاں کام کرنے کا جذبہ۔

یقیناً روح کو درجۂ اوّلیت حاصل ہے اس کے بعد عقل کا درجہ ہے اور اس کے بعد جسم کا۔ مگر چونکہ اس دنیا سے انسان کا تعلق اس کے جسم کے ذریعے وابستہ ہے، جسم ہی وہ مشین ہے جس سے انسان یہاں کے جملہ امور سرانجام دیتا ہے، اس لئے جب تک انسان کی کم از کم جسمانی ضروریات پوری نہ ہوں ۔ معمولی کھانے پینے پہننے اور سر چھپانے کی ـــ اس وقت تک وہ کسی بلند مقام کی طرف آگے نہیں بڑھ سکتا، یہی وجہ ہے کہ کوئی ایسا پروگرام جو انسان کی جسمانی ضروریات کو نظر انداز کرے' قابلِ عمل نہیں ہو سکا۔ اسیطرح انسان کو اللہ تعالیٰ نے عقل کی کسوٹی عطا فرمائی ہے۔ جب تک وہ کسی بات کو اس کے ذریعے پرکھ نہ لے اس کے لئے اس پر عمل کرنا آسان نہیں ہوتا۔ اپنے اور دوسروں کے تجربوں سے نتائج اخذ کرنا اور ان نتائج کی روشنی میں آگے بڑھنا انسان کا خاصا ہے اور یہی چیز انسان کو دوسری انواع سے ممتاز کرتی ہے۔ اگر کوئی پروگرام ایسا ہو جو عقلی دلائل وشواہد پر پورا نہ اترے تو انسان کے لئے اس پر شرحِ صدر کے ساتھ عمل کرنا دشوار ہو جاتا ہے اور آخر میں انسان کی روح یا جوہر ہی اصل انسان ہے۔ جب تک کسی انسان کی روح کو اس کی غذا دستیاب نہ ہو اس کی شخصیت کی تعمیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہر روح فطری طور پر اللہ تعالیٰ کی محبت سے آشنا اور اللہ تعالیٰ کے قرب کی جویا ہے۔ روح کا جسم کے ساتھ تعلق بواسطہ قلب ہے۔ اس لئے ہر قلب میں اللہ کے وجود کا احساس اور اس کی طرف بڑھنے کی امنگ موجود ہے۔ روح گویا چراغ ہے۔ قلب وہ شیشے کی قندیل ہے جس کے اندر یہ قندیل ٹکی ہی ہے[ف] اس چراغ کا تیل یادِ الٰہی ہے۔ قندیل اگر صاف وشفاف ہو یعنی قلب اگر خیالات فاسدہ سے پاک صاف ہو تو چراغِ روح کی روشنی اس میں سے دوبالا ہو کر نکلتی ہے۔ اور طاقچے کو بھی منوّر کر دیتی ہے۔ لیکن اگر چراغ یادِ الٰہی کے تیل سے محروم ہو اور قندیل ہوا و ہوس کے دھوئیں سے سیاہ ہو تو پھر انسان ظلمات در ظلمات میں پھنس کر رہ جاتا ہے اور جو شخص اپنے آپ کو اللہ کے دیئے ہوئے نور سے محروم کرے اس کی راہنمائی کے لئے پھر اور کوئی روشنی باقی نہیں رہ جاتی اور وہ تہ در تہ اندھیروں میں ٹامک ٹوئیے مارتا پھرتا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے جیسے کوئی دریائے عمیق کی تہ میں ہو۔ اس کے اوپر ایک موج ہو۔ اس

ف سورۃ ۲۴، آیت ۳۵ تا ۳۸۔

کے اوپر دوسری موج ہو اور باہر آسمان پر تاریک بادل چھائے ہوئے ہوں۔[1]

اللہ تعالیٰ کی محبت روح کا محور ہے۔ جو روح اللہ تعالیٰ کو بھلا دیتی ہے وہ گویا اپنے محور سے محروم ہو جاتی ہے۔ روح محور سے محروم ہو جائے تو نہ شخصیت کی تعمیر ہو سکتی ہے اور نہ اس میں استحکام پیدا ہوتا ہے، بلکہ روح کے محور سے محروم ہو جانے کے باعث ایسا شخص اپنے بلند مقامِ انسانیت سے نیچے گر جاتا ہے۔ پھر یا تو اسے ہوا و ہوس کی آندھیاں دور دراز مقامات میں اڑائے پھرتی ہیں اور یا وہ شہوت اور غضب جیسے شہ زور اور خونخوار پرندوں کے چنگل میں گرفتار ہو جاتا ہے۔[2]

روح صرف اللہ تعالیٰ سے محبت ہی نہیں رکھتی بلکہ اللہ تعالیٰ کی روحِ کل میں سے پھونکی ہوئی ہونے کے باعث اپنے اندر صحیح قسم کی آزادی کی بے پناہ تڑپ بھی رکھتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہر روح فطرۃً آزاد و بے باک ہے اور اگر روح کی روشنی قلب کی سیاہی یا زنگ کے باعث باہر آنے سے بالکل رک نہ چکی ہو یا قندیلِ قلب میں ٹیڑھا پن پیدا ہو جانے کے باعث اس کا فوکس خراب نہ ہو چکا ہو۔ (اس صورت میں روشنی تو رہتی ہے مگر اندازِ نگاہ میں کجی واقع ہو جاتی ہے۔ جس سے غلط چیزیں صحیح اور صحیح غلط دکھائی دینے لگتی ہیں۔ اسی کو جدید زبان میں "پرورش" کہتے ہیں) تو انسان کے لئے ممکن ہی نہیں کہ وہ کسی کے خوف سے حق بات کہنے یا حق کام کرنے سے باز رہ سکے۔

دو ہی چیزیں انسان کو حق بات کہنے یا حق کام کرنے سے باز رکھتی ہیں۔ ایک نقصان کا خوف اور دوسرے فائدہ کی امید۔ فائدہ کی امید بھی دراصل نقصان کے خوف ہی کی دوسری صورت ہے۔ لیکن جب روح کی اللہ تعالیٰ سے فطری محبت جلا پاتی ہے تو اسے خوف صرف محبوب کی ناخوشنودی کا رہ جاتا ہے اور اسی طرح اس کی امید بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی کے وابستہ رہ جاتی ہے کیونکہ اسے صاف نظر آنے لگتا ہے کہ فی الحقیقت یہاں حکم صرف اللہ کا چلتا ہے۔ اگرچہ بظاہر اس پر اسباب کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ گویا اسی روح کو صحیح آزادی و بے باکی حاصل ہوتی ہے جو اپنی اصل یعنی محبتِ الٰہی پر واپس جا چکی ہو۔ یہ طرفہ تماشا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت ہی کی گرفتاری سے صحیح آزادی میسر آتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی

---

[1] ۲۴: ۲۵ تا ۳۸، [2] ۲۴ = ۳۹ تا ۴۱،

محبت سے آزادی بدترین قسم کی گرفتاری ہو کے رہ جاتی ہے۔

گویا تطہیر و تثبیت اور اختیار و استرداد کا یہ عمل جو مقصدِ حیات اور ذریعۂ تعمیرِ شخصیت ہے صرف اسی صورت میں بآسانی سرانجام پا سکتا ہے جب روح کو چمکا کر رکھا جائے اور اسے مٹی میں دھنسنے سے بچایا جائے[1] تاکہ روح میں جلوہ گر ہونے والا اللہ تعالیٰ کا رنگ آگے افکار و عادات میں پہنچے اور انسان پورے کا پورا اللہ تعالیٰ کے رنگ میں رنگا جائے اور اللہ تعالیٰ کے رنگ سے بہتر کون سا رنگ ہے[2]۔

استحکامِ شخصیت ہی کا دوسرا نام اعلیٰ کردار ہے۔ اعلیٰ کردار تعمیری عادات کے ضبط اور تسلسل کا نام ہے اور ظاہر ہے کہ یہ ایک دن میں نہیں بن سکتا۔ اس کے لئے باقاعدہ اور مسلسل شعوری جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ اعلیٰ کردار کی جڑیں روح کی گہرائی میں ہوتی ہیں، اس کی آبیاری عقل کے پانی سے کی جاتی ہے اور اس کے ثمرات سے معاشرہ ہر لحظہ بہرہ اندوز ہوتا ہے اس کے برعکس پست کردار کی جڑیں زمین سے اوپر ہوتی ہیں۔ اس میں سطحی پن پایا جاتا ہے۔ وہ گہرائی اور استحکام سے محروم ہوتا ہے۔ ہوا و ہوس کی آندھیاں اسے اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر جھکاتی رہتی ہیں۔ وہ پھل پھول نہیں سکتا۔ یعنی اس سے کوئی دور رس اور ہمہ گیر نتائج برآمد نہیں ہو سکتے۔ اگر وہ کچھ تھوڑا بہت پھل دیتا ہے تو ایسا کڑوا اور کسیلا کہ جو کوئی اسے چکھتا ہے بدمزہ ہو جاتا ہے۔

کردار کا سرچشمہ اعتقادات ہیں اور اس کا مظہر عادات و اطوار۔ جب تک اعتقادات صحیح نہ ہوں، عادات و اطوار صحیح نہیں ہو سکتے۔ آراء بدلنے ہی سے اعمال میں انقلاب پیدا ہو سکتا ہے اس لئے ہر انسان کے ذہن میں یہ بات بالکل واضح ہونی چاہیئے کہ اسے یہاں بھیجنے والا کون ہے۔ وہ یہاں کیوں بھیجا گیا اور یہ کائنات کیا ہے۔ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ اسے یہاں بھیجنے والا کوئی نہیں اس کے یہاں آنے کا کوئی مقصد نہیں اور یہ دنیا محض کھیل تماشا ہے وہ ہمیشہ فوری فوائد کا طالب رہے گا۔ جہاں اسے ذرہ بھر فائدہ نظر آئے گا ادھر جھک جائیگا جس سے فائدہ کی امید نہ ہو گی اس سے منہ موڑ لے گا۔ طاقتور سے مرعوب ہو گا۔ کمزور کو دبائے گا۔ دولت کو ہر ناجائز طریق سے حاصل کرنے کی کوشش

---

[1] سورۃ ۹۱، آیت ۹، ۱۰، [2] سورۃ ۲، آیت ۱۳۸،

کرے گا۔ نہ اسے رشوت دینے میں باک ہوگا، نہ دوسروں کا مال کھانے میں۔ اگر زیادہ اجڈ ہوگا تو دوسروں کا مال چرانے یا چھیننے سے بھی گریز نہیں کرے گا۔ جنسی جذبہ اس کی زندگی پر چھایا ہوگا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ حق بات کہنے اور اس پر عمل کرنے کی جرأت سے محروم ہوگا۔ ایسے افراد کی کثرت معاشرہ کو فتنہ و فساد سے بھر دے گی۔ نہ کسی کا مال محفوظ رہیگا، نہ جان، اور نہ عزت۔ ایسے عقائد کے لوگ قرآنِ پاک کی اصطلاح میں کفار ہیں اور ان کا ٹھکانہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم ہے[1]۔

اسلام کائنات اور انسان کے متعلق یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ یہ یونہی خود بخود کسی مقصد کے بغیر وجود میں نہیں آگئے بلکہ ان کا ایک پیدا کرنے والا ہے جس نے انہیں ایک خاص مقصد کے لئے پیدا کیا ہے۔ کائنات میں کوئی افراتفری نہیں بلکہ اس کے باقاعدہ قوانین ہیں جن کے مطابق اسے چلایا جا رہا ہے۔ جیسے ہر انسان کی اس دنیا میں رہنے کی مدت معین ہے اسی طرح پوری کائنات کی مدت بھی معین ہے[2]۔ کائنات اپنے خالق کے تخلیقی فن کا مظہر اور انسان کی ہمت آزمائیوں کے لئے جولان گاہ ہے۔ کائنات کا علم انسان کو حق تعالیٰ کی معرفت کی طرف لے جاتا ہے۔ حق تعالیٰ کی معرفت ان سے محبت کا ذریعہ بنتی ہے اور حق تعالیٰ کی محبت سے تعمیرِ شخصیت کا عمل آسان ہوجاتا ہے۔ کائناتی قوتوں کی تسخیر کے لئے جد و جہد انسان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا موجب بنتی ہے اور ان کی تسخیر انسان کی قوت اور اختیار یعنی اس کی حیثیت میں اضافہ کا موجب ہوتی ہے۔ کائنات کے ذرّے ذرّے میں حکمت کے موتی رکھ دیئے گئے ہیں مگر ساتھ ہی اس کے خالق نے بکمال شفقت و عنایت اسے اس قدر حسین اور جاذب بنا دیا ہے کہ اس کا علم حاصل کرنا کسی پر گراں نہیں گذرتا بلکہ ہر ایک کے لئے مسرت و فرحت کا باعث بنتا ہے۔ پہلے کائنات کا حسن انسان کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے اور وہ اسے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر جب اس پر اس کی حکمتیں اور اسرار و رموز کھلتے ہیں تو وہ ایک نئی لذت ساتھ لاتے ہیں اور آخر میں جب وہ کائنات کی قوتوں کو مسخر کرتا ہے تو اس میں اسے ایک اور ہی طرح کا کیف ملتا ہے۔

---

[1] سورۃ نمبر ۶: ۷۰، ۷، ۵۰ - ۵۱ - ۲۳؛ ۳۲، ۲۷؛ ۳۸، ۲۹؛ ۲۳، ۳۸؛ ۲۷، ۳۵؛ ۱۴، ۲۴

[2] سورۃ نمبر ۳: ۱۹۱ - ۱۵؛ ۵ - ۸ - ۱۲؛ ۳ - ۲۱؛ ۱۸ - ۲۴؛ ۳۸، ۳۹ - ۴۶؛ ۳ - ۳ - ۴۲؛ ۳ - ۲

ہر انسان میں اللہ کی پھونکی ہوئی روح موجود ہے۔ اس کے باعث وہ لطیف ترین مخلوق کائنات ــــ ملائکہ کا بھی مسجود بنا۔ انسان اس زمین پر اللہ کا نائب ہے اور اپنے علم اور اختیار کے باعث باقی تمام مخلوقات سے برتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو اپنے اس نائب کے لئے مسخر کر دیا ہے۔ بالفاظ دیگر حق تعالیٰ نے انسان میں جملہ اشیائے کائنات کی اہمیت جاننے اور انہیں استعمال میں لانے کی استطاعت رکھ دی ہے۔ علم سے انسان اپنی اور کائنات کی قوتوں کا اندازہ کرتا ہے اور اختیار سے ان کا صحیح یا غلط استعمال کرتا ہے یہ اختیار ہی کی امانت تھی جس سے زمین و آسمان لرز گئے تھے اور اس وقت جب سب نے یہ بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا حضرت انسان آگے بڑھے اور انہوں نے اس ذمہ داری کو ہنسی خوشی اپنے سر لے لیا۔

انسان کے علاوہ جملہ کائنات معین قوانین قدرت میں بندھی ہوئی اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتی ہے۔ مگر انسان ــــ کہ اسے ایک حد تک اختیار کی نعمت سے نوازا گیا ہے، وہ چاہے تو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کا راستہ اختیار کرے اور چاہے تو سرکشی کا۔ مَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ۔ یہ مہلت ہر انسان کو اس کی اس دنیا میں زندگانی تک ہے، اور پوری انسانیت کو اس کائنات کے موجودہ دور کی عمر تک اس کے بعد لطیف تر انسانی زندگی کا جو مرحلہ شروع ہوگا اس کا دار و مدار ہر انسان کے ان اعمال پر ہوگا جو وہ یہاں کرتا ہے پھر یا تو اس اختیاری فرمانبرداری کے اجر کے طور پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کے آغوش میں لطیف سے لطیف تر مقامات قرب کی طرف ترقی ہوگی اور یا اس اختیاری نافرمانی کے نتیجہ کے طور پر اللہ تعالیٰ سے دوری کے جہنم میں ابدی اذیت اور عذاب ہوگا۔ اس انجام کے خوف سے زمین و آسمان لرز گئے تھے اور انھوں نے اختیار کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس وقت انسان نے اس ذمہ داری کو قبول کر لیا اور افضل موجودات کا خطاب پایا۔ اللہ تعالیٰ نے اس عظیم ذمہ داری سے نپٹنے کے لئے اسے علم کی قوت اور اپنی روح کی شمع ہدایت بھی عطا فرمائی تاکہ اس شمع ہدایت کی روشنی میں وہ اپنے لئے صحیح راستہ متعین کرے اور

لہ سورۃ ۱۵: ۲۹۔ آیت ۳۰ سورۃ ۴۵: ۱۳۔ آیت ۱۷ تا ۱۳ سورۃ ۲۲: آیت ۶۵، ۶۶، سورۃ ۳۳: آیت ۷۲

اس قوت کے ذریعے اس راہ پر گامزن ہو علاوہ ازیں اس کے پاس یاد دہانی کے لئے وقتاً فوقتاً اپنے پیامبر بھی بھیجے جو اسے اس کے مقصدِ حیات کی طرف توجہ دلاتے۔ اس کے لئے صحیح راہِ عمل کی نشان دہی کرتے بلکہ خود اس پر چل کر بھی دکھاتے اس کے باوجود انسان بار بار اپنے مقصدِ حیات کو بھولتا ہے اور اکثر منزلِ مقصود کی طرف لے جانے والی پکی اور کھلی شاہراہ کو چھوڑ کر پیچ پیچ پگڈنڈیوں کی بھول بھلیوں میں پڑنا پسند کرتا ہے اور اس طرح اشیائے کائنات کے علم پر جہالت اور ان کے صحیح استعمال پر غلط استعمال کو ترجیح دیتا ہے۔ یقیناً وہ ظلوم و جہول ہے اس طرح وہ اپنے آپ کو اپنے بلند مرتبہ فضیلت سے گراتا ہے کہ پست ترین مخلوق سے بھی پست ہو جاتا ہے۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ۔ اور اللہ نے جملہ موجودات کے سامنے اس پر جو اعتقاد کیا تھا اپنے آپ کو اس اعتقاد کا اہل ثابت نہ کر کے حق تعالےٰ کے لئے بھی حسرت کا موجب ہوتا ہے۔ يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ (یٰس)

دینی اور لادینی تصوّرِ حیات میں یہی بنیادی فرق ہے کہ دینی تصوّر ایک خدائے واحد و زندگی کے تسلسل اور اعمال کے نتائج کے گرد گھومتا ہے اور لادینی تصورِ حیات، حیاتِ انسانی کو اسی دنیا کی چند روزہ زندگی تک محدود سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک کامرانی کی کسوٹی دولتِ عشرت اور مراتبِ حکومت ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظریۂ حیات کے قائل ہر طریق سے روپے جمع کرنے ہر تدبیر سے جسمانی لذات حاصل کرنے اور ہر حیلہ سے مراتبِ حکومت پر قبضہ جمانے کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو معاشرہ کی تمام برائیوں کی جڑ ہیں یہ وہ لاشیں ہیں جو خود بھی گلتی سڑتی رہتی ہیں اور اپنے اردگرد بھی بدبو اور تعفّن پھیلاتی رہتی ہیں۔ "دینی نظریۂ حیات کا یہ مطلب ہے کہ محورِ حیات خود غرضی اور ذاتی مفاد نہیں بلکہ اعلیٰ ترین ذات کے ساتھ رفاقت اور اس کے سامنے ذمہ داری ہے"۔ (ہیری ایمرسن ناٹرک)

گویا لادینی تصورِ حیات افراد کو تنگ نظری اور خود غرضی کی طرف لے جاتا ہے۔ افراد کی تنگ نظری اور خود غرضی وبائی امراض کی طرح ایک سے دوسرے کو متاثر کرتی ہوئی آہستہ آہستہ پورے معاشرے کے رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے چونکہ ہر شخص اور گروہ کا ذاتی مفاد بالعموم دوسرے سے مختلف ہوتا ہے اس لئے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ میں ہمواری اور ہم آہنگی کی بجائے انتشار و تصادم رُونما پذیر ہو جاتا

ہے۔ علاوہ ازیں ہر شخص کے ذاتی مفاد پیش نظر رکھنے کے باعث اجتماعی مفاد خطرہ میں پڑ جاتا ہے اور اس طرح یہ طرز فکر و عمل اس سارے ملک یا قوم کو لے ڈوبتا ہے۔ ایسے لوگوں کی مثال ایک کشتی کے مسافروں کی سی ہو جاتی ہے جن میں سے کوئی اپنا چولہا گرم کرنے کے لئے کشتی کا تختہ اکھاڑ کر جلائے اور کوئی آگ تاپنے کے لئے اور یہ نہ سمجھے کہ ؎

ڈوبے گی ناؤ تو ڈوبیں گے ہم

جس انسان کے سامنے صرف مال و زر و جاہ کا حصول ہو وہ اس وقت تک تو خوب چلتا جاتا ہے جب تک اسے یہ چیزیں حاصل رہیں۔ مطلع صاف، سمندر پرسکون، ہوا موافق ہو پھر تو اس کی کشتیٔ حیات نازاں و فرحاں رواں دواں رہتی ہے لیکن اگر کبھی مطلع ابر آلود ہو جائے ہوائیں مخالف چلنے لگیں اور سمندر طوفانی لہروں کی آماجگاہ بن جائے پھر اس کی حالت قابل رحم ہو جاتی ہے۔ حقیقت میں تربیت کردار کے لئے بچوں کی طرح بڑوں کو بھی احساس تحفظ کی ضرورت ہے۔ ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ جس بچہ کو گھر کا تحفظ میسر نہیں آتا اس کی شخصیت ادھوری رہ جاتی ہے یہی حال اس شخص کا ہے جو کائنات میں احساس تحفظ (اور احساس تحفظ اللہ پر ایمان کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا) سے محروم ہے۔ احساس تحفظ سے محرومی گویا امید سے محرومی ہے۔ اور امید سے محرومی جہنم ہے۔ بقول دانتے جہنم کے دروازے پر موٹے حروف میں یہ الفاظ کندہ ہوں گے "یہاں داخل ہونے والو! ہمیشہ کے لئے امید سے دستبردار ہو جاؤ"۔ گویا ناامیدی جہنم کا سب سے بڑا عذاب ہے۔ اگر کسی کو جیتے جی جہنم میں ڈھکیلنا ہو تو اسے ناامیدی میں مبتلا کر دیجئے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک بار بار کہتا ہے کہ "اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا"۔ "مایوسی کفر ہے"۔ اور اس کا علاج خودکشی کے سوا اور کچھ نہیں[1]۔ قرآن پاک کے نزدیک مایوسی اور ناامیدی عذاب کی قسمیں ہیں جو کفر یعنی اللہ تعالیٰ سے انکار کا نتیجہ ہیں۔ قرآن پاک بار بار اعلان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دوست خوف و حزن سے ہمیشہ مامون رہیں گے۔ اور اسے ایمان باللہ کا ثمرہ اور اللہ تعالیٰ کی نعمت قرار دیتا ہے۔ آپ آج بھی دیکھ سکتے ہیں کہ ان ممالک میں جہاں لادینی کا زیادہ رجحان ہے بہت سے لوگ دماغی اور اعصابی امراض میں مبتلا ملتے ہیں۔ اسی طرح وہاں خودکشی

---

[1] سورۃ ۲۹:۔ آیت ۲۳، سورۃ ۱۲، آیت ۸۳،

کے واقعات بھی نسبتاً زیادہ ہوتے ہیں۔

دینی اور لادینی تصورات حیات کے درمیان ایک اور تصور بھی ہے جسے نظریاتی طور پر تو شاید کوئی تسلیم نہ کرے مگر عملاً بیشتر لوگ اسی کے قائل نظر آتے ہیں۔ یہ تصور ہے ایک سے زیادہ خداؤں کا جنھیں خدائے واحد کی خدائی میں حصہ دار گردانا جاتا ہے۔ ایسے لوگ زبان سے ایک ہی خدا کی خدائی کا دم بھرتے ہیں مگر عمل میں دوسروں کی خوشنودی کے لئے اللہ تعالیٰ کے احکام کو بڑی آسانی سے پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی مثال اس روایتی گدھے کی سی ہے جو گھاس کے دو ڈھیروں کے درمیان بھوک سے مر گیا تھا کیونکہ وہ یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ ایک طرف جائے یا دوسری طرف۔ پہلے وہ چند قدم ایک ڈھیر کی طرف بڑھتا پھر اسے خیال آتا دوسرا ڈھیر بہتر ہے اور ادھر جانا چاہیئے۔ ادھر بڑھتا مگر وہاں تک پہنچنے سے پہلے ہی اسے خیال آجاتا کہ نہیں پہلا ڈھیر بہتر تھا اور وہ فوراً اس طرف مڑ آتا۔ جو لوگ اللہ پر ایمان تو رکھتے ہیں مگر اپنے سر کو پوری طرح اس کے سامنے جھکا نہیں دیتے یقیناً وہ اس گدھے سے بدتر ہیں۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری جم کر نہیں کرتے بلکہ جب اللہ تعالیٰ کے احکام ماننے میں فائدہ ہو اس وقت ان پر عمل پیرا ہوتے ہیں جب ایسا کرنے میں نقصان ہو تو آرام سے اپنا موقف تبدیل کر لیتے ہیں[1]۔ کبھی اللہ تعالیٰ کا حکم مان لیا اور کبھی اپنے نفس کا۔ کبھی قومیت کا بت بنا کر اسے پوجنا شروع کر دیا اور کبھی وطنیت کا۔ کبھی پارٹی کا بت بنا لیا اور کبھی ذاتی تعلقات کا۔ اور جہاں اور جب چاہا بڑے مزے سے اللہ تعالیٰ کے احکام کو بھلا دیا۔ یہی شرک ہے جس کے متعلق حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وہ اسے معاف نہیں کرتے باقی جس گناہ کو چاہیں معاف فرما دیتے ہیں[2]۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ شرک سے انسان کی شخصیت منقسم ہو جاتی ہے اور جو شخصیت منقسم ہو جائے نہ اس کی تعمیر ہو سکتی ہے اور نہ اسے استحکام نصیب ہو سکتا ہے۔ قرآن پاک کے مطابق اللہ سے شرک کرنے والے انسان کے تمام اعمال ضائع ہو جاتے ہیں[3]۔ جیسے اس گدھے کا ادھر سے ادھر جانا اور ادھر سے ادھر آنا سب اکارت گیا۔ اگرچہ وہ تا دمِ مرگ اپنے اس عمل سے مصروف رہا۔

جب تک اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان نہ ہو نہ کردار بن سکتا ہے اور نہ شخصیت کی تعمیر ہو سکتی ہے۔

---

[1] سورۃ نمبر ۲۲، آیت نمبر ۱۱ [2] سورۃ نمبر ۴ آیت نمبر ۴۸، سورۃ ۴ آیت ۱۱۶، [3] سورۃ ۶: ۸۸، سورۃ ۳۹: ۶۵

اللہ تعالیٰ پر ایمان کے بغیر زندگی محور سے محروم ہو جاتی ہے اور پھر در بدر دھکے کھاتی پھرتی ہے۔ دراصل آخرت پر ایمان بھی اللہ پر ایمان ہی کا تتمہ ہے اللہ پر ایمان ہی سے زندگی کے تسلسل اور اعمال کے نتائج پر ایمان پیدا ہوتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کیسے گوارا کر سکتے ہیں کہ اچھے اور برے اعمال کرنے والوں سے ایک جیسا سلوک ہو۔ کوئی بھی فہیم و دانا ایسا نہیں کرتا پھر وہ کیوں ایسا کرے گا جس کی وجہ سے ہر فہیم فہیم اور ہر دانا دانا ہے۔ تسلسلِ حیات کا نظریہ انسان میں احساسِ ابدیت پیدا کرتا ہے اور نتائج اعمال کے عقیدہ سے اعمال میں وزن پیدا ہوتا ہے ورنہ اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان کے بغیر اعمال راکھ کی طرح کم وزن ہو جاتے ہیں۔ جنھیں خواہشات نفسانی کی آندھیاں ادھر سے ادھر اڑائے پھرتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان اور آخرت یعنی زندگی کے تسلسل اور اعمال کے نتائج پر یقین ہی "الدین" ہے اسی کو "دین قیم" "دین واصب" اور "دین حنیف" سے تعبیر کیا گیا ہے[1] یعنی "عُروۃ الوثقیٰ" ہے۔ "الاسلام" ہے جس کا احساس ہر شخص کے تحت الشعور میں موجود ہے۔ اسی لئے اسے "دین فطرت" بھی کہا گیا ہے۔ اسی کی یاد دہانی کے لئے پیغمبر حضرات تشریف لاتے رہے اور اسی کو آخر میں جناب رسالتمآب نے نکھری ہوئی صورت میں انسانیت کے سامنے پیش کیا۔ یہی وہ بنیادی چیز ہے جس کے بغیر نہ انفرادی کردار کی تعمیر و استحکام ممکن ہے اور نہ اجتماعی کردار کی۔ ہر پیغمبر نے اسی بنیادی اصول کے گرد اپنے زمانہ کے حالات اور اپنے معاشرہ کے ذہنی معیار کے مطابق انفرادی اور اجتماعی کردار کی تعمیر کا پروگرام پیش کیا جسے اس پیغمبر کی شریعت سے موسوم کیا جاتا ہے بعض ایسے حضرات بھی تھے جنھوں نے کوئی نیا پروگرام دینے کی بجائے اپنے سے پہلے پیش کئے گئے کسی پروگرام ہی پر لوگوں کی توجہ مبذول کی۔[2]

یہ پیغمبر حضرات محض پیغمبر نہ تھے بلکہ پیام مجسم تھے۔ بالفاظ دیگر ان میں سے ہر ایک کی شخصیت ان کے پیغام کا عملی نمونہ تھی وہ نہ صرف اپنے پیغام کے مطابق اپنی انفرادی زندگی بسر کرتے اور دوسرے افراد کی مسلسل تعمیر میں کوشاں رہتے بلکہ اس کے مطابق معاشرہ کی تعمیر کا کام بھی سرانجام دیتے۔

نقشِ حق اول بجاں انداختن
باز او را در جہاں انداختن
(اقبالؒ)

---

[1] سورۃ ۳۹:۲،۳،۳۰ ، سورہ ۲ : ۱۳۲) [2] سورۃ ۵ : ۴۴ ،

ینگ انہی شخصیتوں کو شخصیتیں سمجھتا ہے جن کے پاس کوئی پیغام ہو اور جن کے اندر اس پیغام کو دوسروں تک پہنچانے کی تڑپ ہو۔

"ہر سچی شخصیت ہمیشہ اپنے اندر ایک پیغام رکھتی ہے اور اپنے اس پیغام میں اس کا ایمان ہوتا ہے۔ . . . . . .

"پیغام کی تڑپ ان شخصیتوں پر خدائی قانون کی طرح عمل کرتی ہے جس سے وہ بھاگ نہیں سکتے۔ یہ تڑپ" رکھنے والوں کو پروا نہیں ہوتی کہ اس سے پہلے کئی لوگ اس راہ پر چل کر تباہ ہو چکے ہیں۔ ان کے لئے اپنے قانون کی پابندی ضروری ہو جاتی ہے۔ . . . . . وہ صرف اپنی اندرونی آواز سنتے ہیں"

آگے چل کر یہی مصنف لکھتا ہے:۔

"ایسے شخص کو بلاوا آتا ہے"

". . . . . اسے آواز سنائی دیتی ہے"

"ایسے حضرات کے نام ہزارہا برس تک لوحِ حیات سے محو نہیں ہوتے"

"یہی لوگ شجرِ انسانی کے پھول اور پھل ہیں"

"یہی وہ بیج ہیں جن سے نئے نئے پودے اُگتے ہیں"

"یہ لوگ روایات کے اندھے غلام نہیں ہوتے بلکہ ان کی عظمت روایات سے آزادی میں ہوتی ہے"

"جب عوام اپنے اجتماعی خرخوں، پرانے اعتقادوں اور فرسودہ رسموں سے چمٹے ہوتے ہیں، اس وقت یہ لوگ پہاڑوں کی چوٹیوں کی طرح ان کے درمیان سے سربلند کر کے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور خود اپنا راستہ انتخاب کرتے ہیں" (ترکیبِ شخصیت)

حضورؐ اکرم چونکہ عہدِ جدید کے آغاز میں تشریف فرما ہوئے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ حضورؐ ہی اس دورِ جدید کے دروازہ کھولنے والے ہیں۔ کیونکہ تجرباتی انداز علم سے جو موجودہ سائنس کا بنیادی اصول ہے پہلے پہل قرآن پاک ہی نے متعارف کرایا) اس لئے حضورؐ نے نہ صرف "الدین" کے بنیادی اصول توحید پر بہت زیادہ

زور دیا بلکہ ایک ایسا پروگرام بھی تجویز فرمایا جو (جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے) مختصر اور آسان ہونے کے ساتھ ساتھ اتنا جامع ہے کہ انفرادی اور اجتماعی کردار کی تعمیر کا کوئی گوشہ اس سے باہر نہیں۔ اس میں روح، عقل اور بدیہی تمنوں کے تقاضوں کی صحیح تکمیل کا سامان کر دیا گیا ہے۔ یہ موجودہ سائنسی دور کے جملہ تقاضوں کو پورا کرتا ہے یعنی تجرباتی علم کے معیار پر پورا اترتا ہے اور براہ راست عقل کو متاثر کرتا ہے۔ یہ معاشرہ کی چھوٹی سے چھوٹی وحدت کی ابتدائی ضروریات کو بھی بطریق احسن پورا کرتا ہے اور کسی نسل، رنگ یا جغرافیائی حد بندی تک اپنے آپ کو محدود کئے بغیر پوری انسانیت کے تقاضوں کو بھی عالمی یا بین الاقوامی سطح پر پورا کرتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں اتنا توازن، جامعیت اور لچک موجود ہے کہ اب یہ آخر تک انسانیت کا ساتھ دے سکتا ہے۔

تمام انبیاء و رسل کی طرح حضورؐ بھی اپنا پیغام مجسم تھے۔ چلتا پھرتا قرآن تھے۔ بقول اقبال:

وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں، وہی طٰہٰ

نہیں نہیں حضورؐ اس سے بھی بہت بڑھ کر تھے۔ حضورؐ نے اپنے پیغام پر مبنی معاشرہ بھی قائم کر دکھایا اور جیسے حضورؐ کی ذات بابرکات ہر فرد واحد کے لئے انسانیت کے دم آخر تک مثالی شخصیت رہے گی اسی طرح حضورؐ کا قائم کردہ معاشرہ بھی انسانیت کے لئے تادم آخر مثالی معاشرہ رہے گا اور اس معاشرہ کی سرحدوں کو چھو لینا ہی انسانیت کی معراج ہوگا۔ موجودہ دور کا ایک مغربی مفکر اعلیٰ ترین معاشرہ اسے سمجھتا ہے جس کا ہر فرد سینٹ یا ولی ہو۔ اگر اس لحاظ سے حضورؐ کے قائم کردہ معاشرہ کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آج تک اس معاشرہ کے بغیر جو حضور نبی کریمؐ کی تربیت نگاہ سے وجود میں آیا، دنیا میں کوئی معاشرہ اس معیار کے قریب بھی نہیں پہنچ سکا۔ حضورؐ کے صحابہ کرام میں سے ہر ایک معمولی سپاہی سے لے کر بڑے سے بڑے جرنیل تک اور معمولی شہری سے صدر مملکت تک ولی تھا۔ اور ولی بھی وہ نہیں جو دنیا سے الگ تھلگ ہو کر بیٹھ گیا ہو، بلکہ معاشرہ کے اندر رہ کر ولیوں کی سی زندگی بسر کرتا تھا۔ اس معاشرہ میں ہر نسل اور رنگ کے لوگ اللہ کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے اور بطور انسان کوئی کسی سے کم نہ تھا۔ اس میں اللہ کا رنگ تھا، یعنی محبت تھی۔ مساوات تھی۔ آزادیٔ گفتار و عمل تھی۔ ضبط

تھا۔ مگر ایسا ضبط نہیں جو باہر سے ٹھونسا گیا ہو بلکہ وہ ضبط جو اعلیٰ تعلیمِ اخلاق کے نتیجہ کے طور پر ہر فرد کے اندر سے خود بخود پیدا ہوتا ہے۔ معاشی عدل تھا۔ صحت مند علمی جستجو تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ زندگی سے ذرہ بھر گریز نہ تھا بلکہ عمل اور پیہم عمل پر زور تھا۔ اس متوازن معاشرہ میں نہ تو اجتماعیت نے انفرادی شخصیتوں کو پھلنے پھولنے سے روکا۔ نہ انفرادی شخصیتوں نے اجتماعیت کو خطرہ میں ڈال کر افراتفری اور نراج کی کیفیت پیدا کی۔ نہ بدنی ضروریات کی تکمیل یا عدم تکمیل نے انسانوں کو حیوان بنایا۔ نہ عقلی کاوشوں نے روحانیت سے بیگانہ کیا اور نہ روحانی مصروفیتوں نے عقل و عمل کا دامن چھڑایا۔ نہ قومیت نے انسانیت کے بین الاقوامی پہلو کو نظروں سے اوجھل ہونے دیا۔ اور نہ بین الاقوامی رجحان نے ابتدائی قومی ضروریات کو نظر انداز کیا۔ اس معاشرہ ساز نے (فداہ روحی) اللہ تعالیٰ کی رحمت و استعانت سے اپنی ذاتی مثال اور دن رات کی انتھک کوششوں سے اپنے اس معاشرہ کو ہر لحاظ سے متناسب تعمیر کیا اور اسے حسن و تعدیل سے اس طرح مرصع فرمایا کہ آج چودہ صدیاں گذر جانے کے بعد بھی اس کی خوبیاں دماغ کے لئے روشنی اور قلب کے لئے سرور و کیف کا باعث ہیں۔ اور فن کار کے اپنے حسن کو اس کے اس عمل تخلیق کا حسن چار چاند لگا رہا ہے۔ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَہٗ

کہا جا سکتا ہے اور بجا طور پر کہ پھر وہ مثالی معاشرہ بیس پچیس برس سے زیادہ عرصہ تک قائم کیوں نہ رہ سکا؟ اس لئے تاکہ انسانیت اس معاشرہ کے قائم کردہ معیار کی طرف آگے بڑھے اور خود اپنی محنت سے اس مقام کو پا لینے کی کوشش کرے۔ حضورؐ نے انفرادی کردار کی مثال قائم کر دی۔ مثالی معاشرہ قائم کر دکھایا۔ اپنا پیغام قرآن پاک کی صورت میں محفوظ کرا دیا۔ اس پر مبنی پروگرام مرتب فرما دیا۔ اور یہ چاروں چیزیں اپنی اپنی جگہ شہ کار ہیں۔ حضورؐ بھی۔ حضورؐ کا قائم کردہ معاشرہ بھی۔ قرآن پاک بھی اور شریعت محمدیؐ بھی۔ اب کیا لوگ چاہتے ہیں کہ اس معاشرہ کے وجود کو بھی مستقل طور پر محفوظ کر دیا جاتا اور انسانوں کو آگے بڑھنے کے لئے ذرہ بھر کوشش بھی نہ کرنا پڑتی! پھر ان کے مراتب میں ترقی کیسے ہوتی اور انہیں انعام کس پر ملتا؟

آیئے اب دوسرے پروگراموں پر مبنی معاشروں کو بھی ایک نظر دیکھ لیں۔ اس لئے کہ تقابل سے اسلامی

پروگرام کے خدوخال زیادہ واضح ہو جائیں گے۔ اہل سپارٹا نے بدنی تربیت کو اتنی اہمیت دی کہ باقی ہر چیز کو نظر انداز کر گئے۔ انھوں نے زندگی کے اس پہلو پر زور دینے میں اس قدر غلو سے کام لیا کہ اگر ان کے کسی بچہ کا جسم ذرا کمزور رہتا تو وہ جینے کے حق ہی سے محروم کر دیا جاتا۔ قدیم یونان کی جمہوریت کی اسقدر دھوم ہے مگر وہاں نصف سے زیادہ آبادی جو غلاموں پر مشتمل تھی حق رائے دہندگی سے محروم تھی۔ اور حق آزادی گفتار کی یہ صورت تھی کہ سقراط کو اسی جرم کی پاداش میں زہر کا پیالہ پینا پڑا۔ عیسائیت نے بدن اور اس کی ضروریات سے آنکھیں بند کر لیں۔ یہودیت کی رسوم و قیود نے اس کی روح کا دم گھونٹ دیا۔ اس کے برعکس عیسائیت کا ردعمل یہ ہوا کہ انھوں نے اپنے معاشرہ کو بالکل آزاد چھوڑ دیا۔ موجودہ دور میں وطنیت نے بین الاقوامی جنگوں کا دروازہ کھولا۔ کمیونزم نے اپنی بنیاد طبقاتی نفرت پر رکھی اور بدنی ضروریات کے مہیا کرنے پر زور دیتے دیتے انسانوں کو عقل اور روح دونوں کے تقاضوں سے محروم کر کے انہیں محنت کش حیوانوں کے درجہ پر لے آیا۔ فاشزم نے بھی اپنی بنیادیں نفرت پر استوار کیں اور انسانوں کو احساسات سے عاری مشینیں بنا دیا۔ سرمایہ دارانہ نظام نے نصف سے زیادہ آبادی کو معمولی بدنی ضروریات سے محروم کر کے انہیں اعلیٰ اقدار حیات سے دور رکھنے کی کوشش کی۔

ان پرانے اور نئے نظاموں میں سے ایک بھی انسانیت کا سچا بہی خواہ ثابت نہ ہو سکا۔

افکارِ غزالی

مصنفہ: مولانا محمد حنیف ندوی

امام غزالی کے شاہکار "احیاء العلوم" کی تلخیص اور ان کے افکار پر سیر حاصل تبصرہ

صفحات ۵۰۰ قیمت ۸/۵۰ روپے

ملنے کا پتہ: سیکریٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور